فریضۂ اقامت دین

از
جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

گرفتاران یاس دائمی (۳)

تیسرا گروہ جو کچھ کہتا ہے اور اس کے نظریات اور دلائل کی جو فہرست ہے، اس کا بڑا حصہ تو وہی ہے جو دوسرے گروہ کی زبانی گزشتہ بحث میں آپ سن چکے ہیں۔ اس لیے ان کو دوبارہ نقل کرنے اور ان کی غلطی واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بعض حیثیتوں سے یہ لوگ ان کی بہ نسبت ایک قدم آگے ہیں اور ترک فرض اور فراموشیٔ عہد کی جو بیماری وہاں سیاسی تدبر اور زمان و مکان کی مصلحتوں کے پردوں میں چھپا دی گئی تھی، یہاں صاف گوئی اور "جرأت" کے ساتھ علانیہ ظاہر کر دی گئی ہے اس لیے ان لوگوں کے ظاہر و باطن کی یکرنگی کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ گو اس قلت حیائے ایمانی کا احساس دل پر چوٹ لگاتا ہے جو اس "اظہار جرأت" کے نیچے کام کر رہی ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان لوگوں نے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر پھینک دیے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنوں نے یہ حیاکشی ہوش و بیداری کے عالم میں کی ہے اور کتنوں نے غفلت و بے ہوشی کی حالت میں ! ایک طرف اقامت دین کی اس اہمیت کو سامنے رکھیے کہ اسلام اور قیام دین کی سعی و جہد میں باہم وہی تعلق ہے جو ایک زندہ انسان کی زندگی اور اس کی حرکت قلب میں ہے جیسا کہ ہم اوپر دلائل کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں، پھر اس کے بعد ان لوگوں کی ان —— بظاہر عاجزانہ مگر فی الواقع باغیانہ —— باتوں کا گہری نظر سے تجزیہ کیجیے کہ "یہ نصب العین ہے تو بالکل برحق، مگر ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا۔" توقع ہے کہ اس تجزیے سے آپ پر بھی وہی حقیقت منکشف ہوگی جو ہم کہنی چاہتے ہیں۔ جب اقامت دین کی جد و جہد سے برضا و رغبت کنارہ کش ہو کر، اور باطل کے مقابلہ اور منکرات کے احول میں عدم مداخلت اور صلح کل کی پالیسی اختیار کرکے انسان پیروان اسلام کی صف پائیں میں بھی جگہ نہیں پا سکتا اور اللہ کے رسول نے ایسے انسان کو ایمان کے آخری ذرے سے بھی محروم قرار دیا ہے تو بڑی سے بڑی کمزوری اور مایوسی بھی اس فرض کی انجام دہی سے ایک لمحہ کے لیے بے تعلق نہیں کر سکتی اور اگر کہیں یہ بے تعلقی ہے تو وہاں کسی کمزور سے کمزور ایمان کی تلاش بھی بے سود ہے۔ اسلام نے دنیا کو کوئی ایسا "سستا ایڈیشن" شائع نہیں کیا ہے جس کے تحت اس "دم خم دکھانے" اور "تقدیر سے لڑنے" سے نجات ممکن ہو۔ وہ شخص دھوکے میں ہے جو یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اس لازمۂ ایمانی سے بے بہرہ رہ کر بھی ایمان و رضائے الٰہی کی کوئی مقدار حاصل کی جا سکتی ہے۔ (۵)

تاریخ خلافت کی غیر متعلق بحث ان لوگوں کے فکر و عمل کی بنیادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت جس چیز کو حاصل ہے اور جس کا گذشتہ مباحث میں ابھی تک تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "جو چیز صحابہ کے ہاتھوں بھی تیس برس سے زیادہ قائم رہ سکی اس کے لیے کوئی سعی بالکل لاحاصل ہے"۔ یہ ایک الم ناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں مایوسی اور دل شکستگی کا زہر پیدا کرنے میں اس فقرہ نے جتنا موثر پارٹ ادا کیا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کی المناکی کا صحیح ادراک اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز کو بنیاد قرار دے کر اقامت دین کے فرض کو ساقط سمجھ لیا گیا ہے، اس کا اس فرض کی ادائگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ کسی نظریہ، کسی اصول، اور کسی نصب العین پر ایمان لانے کا دعوی کرنا اور ساتھ ہی اس کے اتباع سے اور اس کے مقتضیات ادا کرنے سے اس بنا پر انکار کر دینا کہ اس نصب العین کو کبھی زمانہ دراز تک برقرار نہیں رکھا جا سکا، اپنے اندر معقولیت کا کوئی شمہ رکھتا ہے؟ اس سے بڑھ کر قول و عمل کے تضاد کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ سوال یہ ہے کہ آپ نے اس شے کو اس لیے اپنا مقصد زندگی ٹھیرایا ہے کہ وہ فی نفسہ حق ہے اور اس کی حقانیت کا علم و یقین اس کو اپنانے پر مجبور کر رہا ہے یا اس کا کوئی دوسرا سبب ہے؟ اگر کوئی دوسرا سبب ہے تو پھر آپ سے نہ کوئی مطالبہ ہے نہ آپ پر کسی جد و جہد کے ترک کرنے کا الزام، لیکن اگر پہلی بات ہے، جیسا کہ توقع کی جانی چاہیے، تو ایک کافر بھی آپ کو یہ طرز استدلال اختیار کرنے میں حق بجانب نہیں قرار دے سکتا۔ تیس اور چالیس برس تو نہیں اگر ایک دن بھی یہ مشن کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا تو اس سے آپ کی ذمہ داریوں میں ذرہ بھر بھی تخفیف نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیے۔ اس لیے کہ آپ نے اس کو حق کہا ہے اور اس کی علمبرداری کا دعوی کیا ہے، یہ دیکھنے کی گنجائش کہاں ہے کہ اس راہ میں کس نے کیا کیا اور کب کیا کیا گیا؟ آپ کے فرائض کی تعیین وہ نصب العین کرے گا جس کو حق سمجھ کر آپ نے قبول کیا ہے۔ تاریخ نہیں کرے گی۔

لیکن اگر آپ کو اپنی "اس دلیل" پر گہرا اعتماد اور اصرار ہے اور اس میں اتنا وزن محسوس کرتے ہیں کہ وہ اقامت دین کی جد و جہد سے سبکدوش کر دینے کے لیے کافی ہے تو ہم گزارش کریں گے کہ ذرا اس کو اور وسعت دیدیجیے، اور اسی اصول پر یوں سوچنا شروع کیجیے کہ مسلمان کی جو صفات و خصوصیات کتاب و سنت میں بیان کی گئی ہیں اور ایمان و اسلام کا جو معیار اللہ اور اس کے رسول نے پیش کیا ہے اس معیار پر پورے اترنے والے اور ان صفات و خصوصیات کے حامل انسان ابو بکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضی، ابو ذر غفاری، سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان ہی کی طرح کے چند سو یا چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں پیدا ہو سکے، اور اس وقت تو اس معیار کے مسلمانوں کا عالم تصور میں بھی وجود ممکن نہیں اس لیے اب ایسے معیار دینی کا ذکر اور خیال ہی چھوڑ دینا چاہیے اور اسلام کی ان مطلوبہ صفات و خصوصیات کے لیے سعی و جہد کرنا بالکل لاحاصل ہے، یہ "ہم جیسے کمزور انسانوں کے بس کا کام نہیں ہے"۔ اگر اجتماعی میدان میں خلافت راشدہ کی قلت عمر اس امر کا حق دے سکتی ہے کہ اب قیامت تک کے لیے قیام دین کے تصور سے ذہنوں کو خالی کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ انفرادی

(حاشیہ صفحہ ۶۰) [1] اس موقع پر "امکان و عدم امکان" "کامیابی کا اسلامی تصور" اور "اقامت دین کے سلسلہ میں بندوں کی ذمہ داری" وغیرہ بحثوں کو جو گذشتہ نمبر میں گذر چکی ہیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہاں اس اجمالی بیان سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ (ص)

زندگی میں بھی اس استحقاق معذرت کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ باوجود اس کے کہ اب ایک ابوبکرؓ بھی پیدا نہیں ہوتا ہے آپ نہ صرف خود کمال ایمانی کے حصول سے مایوس ہو کر اسلام سے علیحدگی پر تیار نہیں بلکہ گمراہوں کو راہ یاب، جاہلوں کو دین آگاہ اور غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کے لیے زندگیاں وقف کیے ہوئے ہیں، تبلیغی انجمنیں قائم کرتے ہیں، اشاعت دین کے ادارے کھولتے ہیں، تعلیم کتاب و سنت کے لیے درسگاہیں جاری کرتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ صدیقؓ و فاروقؓ کی سی اسلامیت کے حصول سے، کہ قرآن کا معیار مطلوب یہی ہے، مایوس ہونے کے باعث اسلام کا نام لینا چھوڑ دیا جاتا ہے؟ آپ کہیں گے کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق اسلام کے کامل المعیار اور اعلیٰ نمونے تھے، ان کے مقابل کا ایمان و تقویٰ اگر ہم نہیں پیدا کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو چھوڑ دیں۔ بلکہ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر ہم اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کریں گے کہ جہاں تک ہو سکے انہی کی طرح کا تدین اپنے اندر پیدا کریں، تاریخ نے ہمارے سامنے اسلام کے یہ اعلیٰ ترین نمونے رکھ دیے ہیں تاکہ اپنے امکان بھر ہم اپنے کو ان پر ڈھالنے کی سعی کریں۔ اب جس کو اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے اس حد تک اس رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کرے اور ان کے مقام ایمانی کی طرف جتنے قدم بڑھا سکتا ہے بڑھاتا رہے۔ ہم اس طرز فکر سے سو فیصدی اتفاق کرتے ہیں۔ ہماری گذارش بالکل اسی مرکز فکر پر مبنی ہے فرق صرف یہ ہے کہ آپ اس کو انفرادیت کے ایک محدود دائرہ میں رکھنا چاہتے ہیں اور ہم اسی کو اجتماعیت تک پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ اسی نقطۂ نگاہ سے آپ کو خلافت راشدہ کے اوراق تاریخ کو بھی دیکھنا چاہیے۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ رضوان اللہ علیہم کی انفرادی زندگیوں کی طرح ان کا طرز خلافت اور ان کی نیابت رسول بھی ایک اعلیٰ معیار تھی جسے اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت نے تاریخ کے سینہ میں محفوظ کر دیا ہے تاکہ دعوت قرآنی کے علم بردار اپنی جدوجہد کے سلسلہ میں اپنے سامنے ایک عملی اور معیاری نمونہ رکھ سکیں اور جس حد تک ان کے دست و بازو میں خدا نے توانائی بخشی ہو اس نمونہ کے اتباع میں صرف کریں اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں جب تک کہ اللہ کا دین اپنی رحمتوں کے ساتھ اس زمین پر اسی طرح نہ چھا جائے جس طرح خیر القرون میں چھا گیا تھا حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ پس اس تیس سالہ دور خلافت کو اپنے لیے مثال اور ایک اسوہ بنائیے اور اس کے جمال جہاں آرا کے عشق سے ہمہ دم اپنے سینوں کو گرم رکھیے۔ حیف ہے اگر اسی نام سے دلوں میں مایوسی اور افسردگی کی لہریں اٹھیں۔ اس نام میں تو بلا کی کشش اور اس کشش میں طوفان کا سا جوش بھرا ہوا ہے۔ اگر ہمارا یقین ہے کہ دنیا کو فلاح و سعادت صرف دین حق کے قائم ہونے ہی پر مل سکتی ہے، اور اگر ہمارے قلوب اس مبارک زمانہ کی سچی قدر اور محبت رکھتے ہیں جبکہ دنیا میں خلافت راشدہ قائم تھی تو اس یقین اور اس محبت کا فطری تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ دل اس افسانۂ کہن کو از سر نو عالم واقعات میں دیکھنے کے لیے ٹھیک اسی طرح بے قرار رہے جیسے کہ کسی کی کوئی عزیز ترین شے کھو گئی ہو اور وہ اس کی جستجو میں دیوانہ وار سرگرداں پھر رہا ہو۔ جس شخص کے ایمان میں یہ شورش نہ ہو وہ دراصل ایمان ہی نہیں، بلکہ تصورات کا ایک بتکدہ ہے۔

نظام اسلامی پر ایک شدید بہتان

سطور بالا میں ہم نے اسلام کے انفرادی اور اجتماعی معیاروں پر جو اشارات کیے ہیں ان سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے کہ روئے زمین پر صرف تیس سال نظام اسلامی کو برقرار سمجھنا تاریخ اسلامی کے

غلط مطالعہ کا نتیجہ ہے اور اس خیال کے پیدا کرنے میں چالاک دشمنوں کی عیاری اور نادان دوستوں کی سادہ لوحی دونوں ہی شامل ہیں۔ اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد بھی مسلمان پیدا ہوئے اور برابر پیدا ہوتے رہے تو ان کی خلافتوں کے بعد بھی نظامِ اسلامی قائم رہا فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ان کی شخصیتیں بے داغ تھیں اسی طرح ان کی خلافتیں بھی خیر کامل کا نمونہ تھیں۔ اور اس دورِ سعید کے ختم ہونے کے بعد جس طرح شخصیتیں ناقص تھیں، مگر پھر بھی مسلمان تھیں، اسی طرح اس وقت کے نظامہائے اجتماعی بھی ناقص تھے مگر پھر بھی بالکل غیر اسلامی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ جس طرح افراد میں اسلامیت کے مدارج مختلف ہوتے ہیں اسی طرح نظامہائے سیاست کے بھی دینی نقطۂ نظر سے مختلف مدارج ہوتے ہیں، جس طرح اشخاص میں کمزوریاں ہوتی ہیں اسی طرح اسٹیٹ میں بھی ہوتی ہیں۔ خود اسی زمانۂ خلافتِ راشدہ کے تمام ادوار اپنی روح میں یکساں نہ تھے بلکہ عثمانی اور علوی دورِ خلافت، صدیقی اور فاروقی ادوار سے فروتر تھے جس پر احادیث اور تاریخ دونوں شاہد ہیں۔ اس لیے جب ہم افراد کی کمزوریوں پر تنقید تو کرتے ہیں مگر ان کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے اسی طرح دورِ خلافت کے بعد قائم رہنے والے سیاسی ڈھانچہ پر سخت سے سخت تنقید تو کر سکتے ہیں اور اس کو جاہلیت کے عناصر سے مخلوط بھی کہہ سکتے ہیں مگر انتہائی زیادتی ہوگی اگر اس کو بالکل غیر اسلامی قرار دیدیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس طرح علمائے حق ضعیف الایمان اور گنہگار انسانوں کی ہدایت وارشاد کا فرض ادا کرتے تھے اسی طرح حکمرانِ وقت اور اس کے سیاسی نظم ونسق پر بھی اظہارِ نکیر کرتے رہے اور افراد کی طرح حکومتوں کی اصلاحِ احوال کی کوشش بھی ان کی زندگی کا مستقل مشن تھا۔ لیکن انھوں نے کسی زمانہ میں کسی حکمران کے خلاف یہ فتویٰ صادر نہیں کیا کہ اس کی حکومت سراسر غیر اسلامی اور کافرانہ ہے۔ ہاں اس کے اندر جو بگاڑ تھا اپنی مقدرت کے مطابق اس کے سدھار کی سعی کرتے رہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے بعد بھی مدتوں جو نظامِ سیاست ممالکِ اسلامی میں جاری رہا وہ کبھی نہ کسی حد تک اسلامی تھا، عدالتیں اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے کرتی تھیں، سزائیں آئینِ شرع کے ماتحت دی جاتی تھیں، جائدادیں احکامِ دین کی رو سے تقسیم کی جاتی تھیں، غرض زندگی کے عام معاملات میں اتھارٹی عملاً کتاب وسنت ہی کو حاصل تھی، جو کچھ خرابی بھی حکمرانوں کی ذات میں تھی مگر نظامِ دین کی بالادستی اس طرح گوشہ گوشہ پر چھائی ہوئی تھی اور اس کا رُعبِ جلال ووقار، ذہنِ عام کو اس طرح اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا کہ ان حکمرانوں کو بھی اپنی کوئی غیر اسلامی کاروائی انجام دینے کے لیے چہرے پر تشرع کی نقاب ڈالنی پڑتی تھی اور اس بات کا وہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے کہ خدا کے دین اور قانون کی جگہ اپنا دین اور قانون چلا دیں۔

استدراک لیکن ہماری اس تقریر سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم ان تمام حکمرانوں کی حکومتوں کو خالص اسلامی نظام سمجھتے ہیں اور اقامتِ دین کا فرض یاد دلانے کا مقصد یہ ہے کہ معتصم باللہ یا ہارون الرشید کی طرح کی کوئی حکومت قائم کرنے کی دعوت دیتے اور اس پر مطمئن ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں، بلکہ دکھانا یہ مقصود ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام کے بعد بھی ایک مدتِ دراز تک اللہ کا دین دنیا میں قائم ونافذ رہا، اگرچہ اپنے مظاہر کے اعتبار سے بھی ناقص تھا اور اپنی روح کے اعتبار سے بھی۔ اسی لیے اس خیال کو اپنے ذہن میں جگہ دینا کہ یہ نظام صرف چند دنوں ہی قائم رہا، نہ صرف اسلام سے لوگوں کو دور کرنا ہے بلکہ تاریخی بددیانتی بھی ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے علمی، دماغی، مالی اور جسمانی ذرائع سے کام لیتے ہوئے اپنے اس

مقصد زندگی کی خاطر مسلسل جدوجہد کرتے رہیں۔ نمونۂ کمال کے طور پر سامنے خلافت راشدہ کی مثال ہو، پھر اس مثال کی جا تک
عملی پیروی ہماری حد استطاعت میں ہو اسے سرانجام دے دیں، بس اسی پر ہماری مسئولیت ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح
صدیق و فاروق بن جانا ہم پر فرض نہیں بلکہ ان کے نمونوں کو سامنے رکھکر حتی الامکان زیادہ سے زیادہ ان سے مماثلت
پیدا کرنا ہمارا فرض ہے، اسی طرح، بہرحال، ان ہی کی طرح کی خلافت قائم کر دینا ہماری ذمہ واری نہیں ہے بلکہ ہماری اصل ذمہ داری
یہ ہے کہ ہم سے جہاں تک ہو سکے ان کی قائم کردہ خلافتوں سے بیش از بیش مشابہت رکھنے والا نظام اجتماعی قائم کرنے کی سعی کریں اور
آگے آنے والی نسلیں یکے بعد دیگرے اس مشابہت کے رنگ کو نمایاں سے نمایاں تر کرتی رہیں۔

متربصین کا گروہ

اب ان حضرات کے افکار و اعمال کا جائزہ لیجیے جو انتظار اور تربص کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور خود سلامتی و بے فکری کے محفوظ گوشوں میں بیٹھے ہوئے دوسروں کی ثبات قدمی اور تیز گامی کا حساب لگا رہے ہیں اور اس نصب العین ہی کو اپنی زندگیوں کا تنہا مقصد سمجھنے کے باوجود میدان سعی و عمل میں اس لیے نہیں اترتے کہ پہلے سے اس میدان میں اترے ہوئے لوگوں کی عزیمت انھیں مشکوک نظر آتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام صالح اور متقی اور مقبول الصلوٰۃ نہ ہو تو یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اس کے پیچھے ہی نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے بلکہ سرے سے نماز ہی ترک کر دیں گے اور غالباً اس یقین کے ساتھ ترک کر دیں گے کہ کل داور محشر کے سامنے یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ خدایا! ہم تو نماز کو فرض عین ہی سمجھتے تھے اور چوبیس گھنٹہ اس کے لیے باوضو رہتے تھے مگر موذن کی صداؤں اور امام محلہ کی نمازوں میں ہم کو خلوص و للہیت کی روح نظر نہیں آتی تھی اس لیے ہم نے نماز نہیں پڑھی۔ ہم باوجود غور و فکر کے اس طرز فکر و استدلال کی کوئی شرعی یا عقلی بنیاد نہیں پا سکے۔ فرض کیجیے کہ زید اقامت دین کی دعوت دے رہا ہے اور ان لوگوں کو، جو اتباع قرآن اور علمبرداری اسلام کے مدعی ہیں، ان کی فرض ناشناسیوں پر جھنجھوڑ کر، اور غفلت شعاریوں سے بیدار کر کے ان کا فرض زندگی یاد دلا رہا ہے اور اپنے طور پر اس راہ میں قدم بھی رکھ دیتا ہے لیکن جہاں تک اس کی عملی صلاحیت، خلوص اور عزیمت کا تعلق ہے آپ کے قلب کو پورا اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ اور اس کے سارے ہمسفر نا اہل، بے عمل، غیر مخلص اور غیر متقی دکھائی پڑتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان کی یہ ساری خامیاں آپ کے فرض کو ساقط اور آپ کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کس طرح کر دیں گی۔ کیا آپ نے اس امر کو اس لیے حق مانا ہے کہ زید اور اس کے ساتھیوں کی یہی رائے ہے؟ کیا آپ نے دین حق کی اقامت کا فریضہ اس شرط کے ساتھ اپنا مقصد زندگی تسلیم کیا ہے کہ پہلے زید اور اس کے ہمراہی ادائے فرض کا عملی ثبوت دے لیں تو ہم اپنے نرم گرم بستروں سے اٹھیں اور اپنی خوابگاہوں سے باہر قدم نکالیں گے؟ کیا قرآن کی مرکزی دعوت کے آپ اسی وقت مکلف ہیں جب دوسروں کو اس کی راہ میں قربانیاں کرتے دیکھ لیں؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور قرآن گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر فرد اپنی استطاعت کے مطابق اس فریضہ کی بجا آوری کا بطور خود ہر حال میں ذمہ دار اور مسئول ہے، تو اپنے نفس کی حیلہ سازیاں اور غفلتیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی کمزوریاں ٹٹولنے کی آپ کو فرصت مل جاتی ہے؟ دوسرے اگر فی الواقع ایسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو خدا کے روبرو اس کے جوابدہ وہ خود ہوں گے

آپ اس کھود کرید کی زحمت بلاوجہ کیوں اٹھاتے ہیں، آپ اپنے نامۂ اعمال کی فکر کیجیے۔ ہاں اگر ان کے حالات سے کچھ درس ملتا ہے تو اس کو لے لیجیے۔ لقمان حکیم سے پوچھا گیا "تم نے ادب کس سے سیکھا" جواب دیا "بے ادبوں سے" مومن کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکیم پیدا کیا ہے اور ایسی ہی حق بیں، عبرت پذیر اور حکمت پسند نگاہوں سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ سارا قرآن اس نے مغضوب اور گمراہ قوموں کے تفصیلی تذکروں سے اسی لیے تو بھر دیا ہے کہ مسلمان ان جیسی حرکتوں کے ارتکاب سے بچیں، اس لیے آپ کا اس صورت حال میں جو فرض ہونا چاہیے وہ صرف یہی ہے کہ ان کی خامیوں، ظاہر داریوں اور غلط کاریوں سے اپنے دامن بچا کر خالص للہیت اور عزیمت کے ساتھ اس جھنڈے کو لے کر آگے بڑھیں اور اگر ہوسکے تو ان کے لئے ہدایت، عزیمت، خلوص اور توفیق عمل کی دعا بھی کرتے جائیں کہ بہرحال ان کی چیخ پکار، اگرچہ ان کی اپنی حد تک محض "زبانی لقلقہ" تھی مگر آپ کے حق میں ہادی اور مذکر ثابت ہوئی، اس لیے وہ آپ کے شکریے کے مستحق ہیں نہ کہ مخالفت کے کہ ان کے انہی "زبانی لقلقوں" نے غفلت کے پردے چاک کر دیے اور آپ کو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اس نادان اور بدنصیب انسان پر، جو تاریکیوں کے ہجوم میں سرراہ چراغ لے کر کھڑا ہو اور دوسروں کو تو ان کی منزل مقصود دکھا رہا ہو مگر خود اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہو، آپ کو ترس تو ضرور آنا چاہیے مگر اس پر آوازے کسنے اور اعتراضات کرتے رہنا بے انصافی، اور اس کی پروی میں چراغ کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھانا اور پشت بمنزل ہو رہنا حماقت اور دیوانگی ہے۔ سعید وہ ہے جو دوسروں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ قائل کی شخصیت کے بجائے اس کے قول کو دیکھا جائے۔ پس اقامت حق کی پکار سن کر ان بندگان خدا کا طرز عمل اختیار کیجیے جو سعید ہوں، جو دانا اور حقیقت جو ہوں اور جن کی تعریف قرآن کی زبان میں یہ ہے کہ:-

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ — جو باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور ان میں سے بہتر باتوں کو اپنے عمل و اتباع کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔

. . . .

اس لیے اس "قول" — دعوت اقامت دین — پر اس پہلو سے بحث تو کی جا سکتی ہے کہ آیا وہ "احسن القول" ہے یا نہیں؟ لیکن جب آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول کے احسن ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس کا ہر مسلمان کا تنہا فریضۂ زندگی ہونا شک و ریب سے بالاتر ہے تو پھر اس پر لبیک کہیے اور اگر ساری دنیا بھی اس کے اتباع سے جی چرا رہی ہو تو یقین کیجیے کہ اس سے آپ کی اپنی ذمہ داریوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوسکتی اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہوسکتا ہے کہ دوسروں کے عمل اور عزم کا انتظار کرتے رہیں۔ یہ انتظار تو حق پرستی کی ضد ہے اور جو شخص حق کو مانتے ہوئے انتظار کی پالیسی اختیار کرتا ہے وہ دراصل حق کو بدنام کرتا اور اس کی بے حرمتی اور تضحیک کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اگر ہمیں صاف گوئی پر معاف کیا جائے تو ہم اس موقع پر اس رسوائے عالم گروہ کی عادات و خصوصیات کو یاد دلائیں جس نے رسولؐ اور اصحاب رسول کے مجاہدات اقامت دین کے سلسلہ میں یہی تربص کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی جس کے واسطے مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے یہ احساس فرض کافی نہ تھا کہ یہ لوگ جس امر حق کے لیے جانفروشی کر رہے ہیں اسی کو ہم نے بھی اختیار کیا ہے اس لیے ان کے پہلو بہ پہلو چل کر اپنے فرض کو ادا کریں، اس کے برعکس ان لوگوں کا وطیرہ یہ تھا کہ اس کشمکش سے علحدہ رہ کر اس کے نتائج کا اندازہ لگاتے رہتے اور اس وقت مسلمانوں کی جماعت میں

آتے جب ان کی فتح کے جھنڈے لہراتے دیکھ لیتے۔ (اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ)
غور فرمائیے کہ ان لوگوں کی ذہنیت، جو اقامت دین کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے بھی اس کے لیے آمادۂ عمل نہیں ہوتے، کتنی بنیادی مشابہت رکھتی ہے اُس ذہنیت کے ساتھ جس پر منافقوں کے طرز عمل کی اساس تھی؟ جس طرح وہ حق کی حمایت حق کی خاطر نہیں کرتے تھے اسی طرح ان لوگوں کے نزدیک بھی حق کا مجرد حق ہونا ہی آمادگی عمل کے لیے کافی نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وہ لوگ مسلمانوں کی فتح کا انتظار کیا کرتے تھے اور یہ حضرات قیام دین کے داعیوں کے عزم و اخلاص کے بارے میں کسی "شرح صدر" کے منتظر ہیں۔ لیکن اتباعِ حق اور ادائے فرض سے بھاگنے میں دونوں مشترک ہیں۔

بدبختی کی انتہا کاش معاملہ یہیں ختم ہو جاتا اور ان سب لوگوں نے انتظار اور تربص کے صرف سلبی پہلو پر ہی اکتفا کر لیا ہوتا، مگر یہ دیکھ کر صبر اور ضبط کا دامن سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے کہ خدا پرستی، اتباع قرآنی اور عشق محمدی کی دعویدار امت میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اس ساعتِ ہمایوں کے انتظار میں شوق مجسم بنے بیٹھے ہیں جب طاغوتی اقتدار کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر اقامت دین کے "جھوٹے مدعی" میدان سے بھاگ کھڑے ہوں گے اور انھیں اپنے جذبات طعن و تشنیع کی تسکین دہی کا موقع نصیب ہوگا۔ یہ حضرات ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ یہ فرما کر گویا اپنی ذمہ داریوں کا حق ادا کر دیتے ہیں کہ ہوش سے عاری اور جوش کے اندھے لوگوں کا ایک گروہ ہے جو قیام دین کا شور مچا رہا ہے، حوادث و مشکلات خود ہی ان کا فاتحہ پڑھ دیں گے۔ لیکن شاید انھیں خبر نہیں کہ ان کے اس نشتر طعن کی زد خود ان کی اپنی رگ گلو تک جا پہنچتی ہے۔ افسوس! مسلمان کا دل اب قیام دین کی حسرتوں سے بھی اس درجہ محروم ہو گیا ہے کہ اگر خود نہیں کچھ کر سکتا تو دوسروں کا کچھ کرنا بھی اس کو گوارا نہیں رہا اور نہ اس کی نیک خواہشات کا اس کے دل میں گذر باقی رہا۔ آخر یہ باور کرنے کے لیے کہاں سے دل و دماغ لائے جائیں کہ جو سینہ، دین حق کی محبت اور فدویت کا امین بنایا گیا تھا اب اس میں ان آرزوؤں کی پرورش کی جا رہی ہے جو صرف مساعی کفر کے خلاف مخصوص ہونی چاہیے تھیں۔ حالانکہ اگر میرے اندر اتنی غیرت اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ اور قائم کرنے کے لیے قدم بڑھا سکوں تو میرے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ اس کی تمنا سے اپنے قلب و دماغ کو ایک لمحہ کے لیے بھی خالی نہ ہونے دوں اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کے لیے قدم اٹھا رہے ہوں تو ان کے لیے اخلاص عمل، ثبات قدم، نصرت حق، حسن انجام اور فوز مرام کی دعائیں کروں۔ لیکن اگر اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرت حق کی آخری چنگاری بھی میرے اندر بجھ رہی ہے، اور اگر اس سے آگے بڑھ کر میں اس دعوت حق کو فتنہ قرار دے دوں، لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے لگ جاؤں اور اس کے لیے حوادث روزگار کی تمنائیں کروں تو میری بدبختی کی یہ انتہا ہو گی اور ایسی صورت میں مجھ کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم معلوم ہونی چاہیے کیونکہ حالات اور مظاہر کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ میں بالکل اسی مقام پر ہوں گا جہاں سے کچھ کور باطن لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے فداکار ساتھیوں کو اس نگاہ سے دیکھ رہے تھے جس کا ذکر قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:-

.....يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ (توبہ-۱۰) — یہ لوگ تمھارے نذر آفات ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

یا پھر وہاں، جہاں سے پیغمبر عالم کی دل نشیں اور سحر کن صدائے حق کو یہ کہہ کر ٹالا گیا تھا کہ:-

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (طور-۳) یہ ایک (سحر طراز) شاعر ہے، ہم اس کے لیے حوادث روزگار کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

پس جنھیں اللہ نے عقل دی ہے انھیں پوری سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اس طرزِ عمل پر غور کرنا چاہیے جو نری جہالت کی پیداوار ہے اور جس کے ساتھ ایمان کی محبت کبھی جمع نہیں ہو سکتی۔

مہدی موعود کے منتظر

آخری گروہ ان لوگوں کا ہے جو مہدی موعود کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان کے فکر و استدلال کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ "آنحضرت صلعم نے تیس سال کے بعد خلافتِ راشدہ کے ختم ہو جانے اور پھر قرب قیامت میں امام مہدی کے ہاتھوں اس کے از سرِ نو قائم ہونے کی خبر دی ہے۔" اور نقطۂ انجام یہ ہے کہ "اس نصب العین کے برحق ہونے کے باوجود اب ہم اس کی اقامت کے مکلف نہیں۔" دین اور اس کے اصول و مطالبات سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ اب اس قسم کی باتوں کو بھی دلیل سمجھا جاتا ہے اور اتنی زبردست دلیل جو مسلمان کی زندگی کا مطمحِ نظر ہی بدل دے سکتی ہے۔ ضرورت تو نہ تھی کہ اس قسم کی مہمل باتوں کی تردید میں وقت، کاغذ اور روشنائی کا ضیاع برداشت کیا جاتا مگر اس مصیبت کا کیا علاج کہ اس افیون کی گولی نے نہ صرف ہمارے عوام بلکہ کتنے ہی مدعیانِ علم اور اربابِ تقویٰ کو مدہوش اور بے حس بنا رکھا ہے اس لیے انھیں بتا دینے کی ضرورت ہے کہ جس دیوار کا تم نے سہارا لے رکھا ہے اس کی بنیاد ریت سے اٹھائی گئی ہے تاکہ جس کو ترکِ فرض کی ہلاکت خریدنی ہو پورے علم و شعور کے ساتھ خریدے۔

روایاتِ مہدی کی حیثیت سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ظہور مہدی کی خبر ہمیں ملی کہاں سے ہے اور حقائقِ دینی کی فہرست میں اس کا مقام کیا ہے؟ سو ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ قرآن کے صفحات اس کے ذکر سے بالکل خالی ہیں۔ حالانکہ اگر تعلیماتِ دین میں اس امر کو کوئی ایسی اہمیت، جو ہماری زندگی کا مقصد ہی بدل دے سکتی ہو، حاصل ہوتی تو عقل عام چاہتی ہے کہ قرآن اس کے متعلق ہم کو واضح ہدایتیں دیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لے دے کر اس کا ذکر روایتوں میں آتا ہے مگر یہ روایتیں بھی اس پایہ کی ہیں کہ طبقۂ اولیٰ کی کتبِ احادیث میں سے کسی ایک کے اندر بھی وہ بار نہ پا سکیں، نہ امام بخاری نے ان کو درخورِ اعتنا سمجھا، نہ امام مسلم نے، نہ امام مالک نے، صرف تیسرے طبقہ کی کتابوں میں یہ دکھائی پڑتی ہیں، لیکن جب ان کو محدثانہ معیارِ تحقیق پر رکھ کر پرکھا جاتا ہے تو ایک روایت بھی کھری ثابت نہیں ہوتی اور ان کے اکثر و بیشتر راوی شیعہ نکلتے ہیں۔ روایت کے الفاظ پر نگاہ ڈالیے تو ان میں صاف طور پر شیعوں کے مخصوص عقائد اور خیالات کی روح جھلکتی نظر آتی ہے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر علمائے محققین کا ایک گروہ ان احادیث کو افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔

نرالی منطق لیکن اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ احادیث موضوع نہیں ہیں اور فی الواقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہور مہدی کی پیشگوئی کی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کو اقامتِ دین کے فریضہ سے کیا تعلق؟ اس سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ اتنی ہی تو ہے کہ اس دنیا کا نظام فنا ہونے سے پہلے ایک دورِ مبارک آئے گا جب سطح زمین کے ایک ایک گوشہ سے ظلم اور فساد مٹ جائے گا، دنیا عدل سے بھر جائے گی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی طرح کی "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" ہفت اقلیم میں قائم ہو جائے گی۔ لیکن اس سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ بیچ کے زمانوں کے لیے ساری دنیا پر کفر و طاغوت کی فرماں روائی مقدر ہو چکی ہے؟ اس بیچ کوئی دور کا بھی

اشارہ اس امر کا موجود نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کے اختتام سے لے کر ظہور مہدی تک زمین کے کسی بھی خطہ پر اللہ کا دین قائم نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے تاریخ گواہ ہے کہ خلافت راشدہ کے ختم ہونے کے ستر برس بعد ہی حضرت عمر بن عبد العزیز کے ہاتھوں مملکت اسلام میں قریب قریب وہی بہار سعادت پھر آگئی جو خیر القرون میں تھی، اور اس دور کو بھی خلافت راشدہ کا دور تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ جس پایہ کی ظہور مہدی والی روایات ہیں اسی پایہ کی دوسری روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ یہ پیشینگوئیاں کی گئی ہیں کہ مہدی موعود کے علاوہ، اور ان سے پہلے، اور بھی علمبرداران قیام دین اٹھیں گے جن کی حمایت و نصرت مسلمانوں پر واجب ہے۔ مثال کے طور پر دو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں:-

(۱) اذا رأیتم الأیات السود قد جاءت من قبل خراسان فاتوھا ولو حبوا علی الثلج فان فیھا خلیفۃ اللہ المھدی

جب تم یہ دیکھو کہ خراسان کی طرف سے سیاہ نشانات آرہے ہیں تو وہاں پہنچنا — اگرچہ تمھیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے — اس لیے کہ ان نشانات کے اندر اللہ کا ہدایت یافتہ خلیفہ ہوگا۔

(۲) یخرج رجل من وراء النھر یقال لہ الحارث حراث علی مقدمتہ رجل یقال لہ منصور یمکن لآل محمد کما مکنت قریش لرسول اللہ وجب علی کل مسلم نصرہ (ابو داؤد)

ماوراء النہر سے "حارث حراث" نامی ایک شخص نکلے گا جس کا پیش رو (ہراول) منصور نامی ایک آدمی ہوگا۔ وہ آل محمد کے لیے قوت و اقتدار پیدا کرے گا جس طرح کہ قریش نے رسول اللہ کے لیے کیا۔ اس کی مدد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ ان روایتوں میں جن اشخاص کے ظہور کی خبر دی گئی ہے ان سب سے مراد ایک ہی شخص یعنی وہی مہدی موعود ہیں کیونکہ مہدی موعود کا ظہور، حسب بیان روایات، مدینہ منورہ سے ہوگا نہ کہ ماوراء النہر یا خراسان سے، اسی طرح ان کا نام آنحضرت صلعم کے نام پر ہوگا نہ کہ "حارث حراث" نیز یہ کہ وہ اہل عرب کے جلو میں نکلیں گے نہ کہ خراسانی یا تورانی افواج کو لے کر۔ پھر یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ ان روایات میں حصر ہو گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام داعیان حق کی فہرست گن دی ہے جو قیامت تک اقامت دین کا علم لے کر اٹھنے والے ہیں۔ بلکہ ان روایتوں میں، بشرطیکہ وہ صحیح ہوں، صرف بعض افراد اور زمانوں کا ذکر آیا ہے اور مقصود اس امر کی تاکید ہے کہ جب کبھی بھی ایسے مواقع پیش آئیں تو ہر مسلمان کا فرض ہو جائے گا کہ خدا کی راہ میں اپنے کو پیش کر دے۔

پس ان روایات میں نہ صرف یہ کہ مہدی موعود کے ماسوا بھی حق کے مجاہدوں اور دین قیم کو زندہ و پائندہ کرنے والوں کی آمد کی بشارت سنائی گئی ہے بلکہ ہر مسلمان پر واجب گردانا گیا ہے کہ سر کے بل بھی چلنا پڑے تو چل کر ان دعاۃ حق کے پاس پہنچے اور ان کی اعانت و اطاعت میں جان کی بازی لگا دے۔ اس طرح ان اوہام کی جڑ کٹ جاتی ہے جو مہدی موعود کے نام سے پیدا کر لیے گئے ہیں۔

پھر قطع نظر ان روایات کے، اصل سوال تو زمن زندگی کا ہے۔ جب یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقامت دین کا فریضہ ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید اور اس کی خاطر جدوجہد کرنا اس کے ایمان کا معیار و مظہر ہے اور جب کہ مومن کی عین فطرت ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ باطل اور منکر کو جینے کا حق نہیں دینا چاہتی خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں موجود ہو اور جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اتباع قرآن کے عہد کا سب سے پہلا اور سب سے آخری مطالبہ ہی یہ ہے کہ انسان کا پائے سعی و جہد اس وقت تک نہ تھمے جب تک کہ دین الٰہی کی ایک

دفعہ بھی معطل ہے اور زمین کا ایک ذرہ بھی باطل کے پاؤں تلے دبا ہے تو ہر مومن کو یہ جدوجہد لازماً کرنی پڑے گی اور ہر حال، ہر دور، ہر ماحول اور ہر جگہ کرنی پڑے گی۔ امام مہدی اگر آئیں گے تو وہ اپنا فرض ادا کریں گے نہ کہ میرا اور آپ کا۔ ان کی تمام دوڑ دھوپ اپنے اس بوجھ کو سر سے اتارنے کے لیے ہوگی جو اللہ رب العالمین کی طرف سے ان پر ڈالا گیا ہوگا۔ ان کا کوئی فعل کسی بھی مدعی اسلام کے ادائے فرض کا قائم مقام نہ ہوگا۔ نہ تو وہ کسی دوسرے کے لیے نماز پڑھیں گے، نہ روزے رکھیں گے اور نہ ہی جہاد و قتال کریں گے۔ آپ آج ہی ان کی مساعی پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں جبکہ ان کا وجود ابھی عالم تصور اور دنیائے آرزو سے باہر بھی نہیں آیا ہے مگر یقین کیجیے کہ وہ اس وقت کے بھی کسی مسلمان کے عوض تلوار نہ چلائیں گے جو ان کے زمانہ میں موجود ہوگا۔ اس وقت بھی ہر مسلمان کو وہ اپنا اپنا فرض ٹھیک اسی طرح ادا کرنا ہوگا جس طرح امام موصوف کو۔ یعنی حضرت مسیحؑ کے الفاظ میں "ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہوگی" اور جو ایسا نہ کرے گا "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس لیے ہر مسلمان کو یہ دعا اور یہ آرزو تو ضرور کرنی چاہیے کہ اس کو وہ دن دیکھنا نصیب ہو جب امام مہدی اپنی تمام تر برکتوں کے ساتھ ظہور فرما ہوں گے اور ظلم و فساد کے بوجھ سے کراہتی ہوئی دنیا عدل و قسط کی رحمتوں سے مالا مال ہو جائے گی مگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو اس وہم میں نہ مبتلا ہونا چاہیے کہ حضرت موصوف اکیلے صدقہ میں اب سارے مسلمان بندگی کی ذمہ داریوں یعنی اقامت دین کی جد و جہد سے سبکدوش کر دیے گئے ہیں، جس طرح عیسائی حضرات اس خوش گمانی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ مسیح علیہ السلام نے سولی پر چڑھ کر ہم کو حسن عمل سے بے نیاز کر دیا ہے۔

احتساب نفس کی ضرورت اقامت دین سے دامن بچانے والے مسلمانوں کے یہ پانچ مختلف گروہ ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان میں سے ہر گروہ کے خیالات اور دلائل کو بیان کرکے ان کی غلطی واضح کی جائے۔ توقع ہے کہ ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے اور حق طلبی کے جذبات کے ساتھ غور کیا جائے گا اور روایتی، گروہی، سیاسی اور تقلیدی تعصبات سے بالاتر ہو کر خالص خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے اپنے مشاغل زندگی کا جائزہ لیا جائے گا۔ یاد رہے کہ نفس اپنا احتساب کرنے میں سخت حیلہ گر اور فریب کار واقع ہوا ہے۔ اس پر کسی غیر مانوس اور نامطلوب حقیقت کا سامنا کرنا بڑا ہی شاق ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت کے خلاف تو وہ اپنے ترکش دجل کا آخری تیر تک استعمال کر ڈالتا ہے جو اس سے قربانیوں کی طلب گار ہو، صرف جان اور مال ہی کی قربانیاں نہیں بلکہ جذبات و حسیات کی بھی، پندار علم و فکر کی بھی، سابق طرز عمل کی محبت اور عصبیت کی بھی، کہ بسا اوقات ان چیزوں کی قربانیاں جان و مال کی قربانیوں سے بھی زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ ادھر سے نور حق کی تجلی چمکتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ سمت قبلہ یہی ہے، ادھر نفس کے چھچھے اور وسوسے اٹھتے ہیں اور انسان سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب تک کی تیری ساری تگ و دو باطل کی راہ میں تھی؟ کیا زمانے کے اقطاب و ابدال اور وقت کے مراکز علم و دانش جن سمتوں کی طرف جا رہے ہیں وہ سب کی سب غلط ہیں؟ یہ سوالات نفسیاتی حربوں سے اتنے مسلح اور اتنے جذبات انگیز ہوتے ہیں کہ انسان ان سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اسے حق نہیں مانتا۔ یہ نفس انسانی کی وہی جبلی کمزوری ہے جو ہر دعوت حق کے قبول کرنے سے مانع ہوتی رہی ہے اور ہر نبی کی آواز کے جواب میں بدبخت انسانوں کی زبان سے یہ آواز بلند کراتی رہی ہے کہ:-

بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا — ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

پس نفس کی اس مہلک کمزوری اور دسیسہ کاری سے پوری طرح چوکنے ہو کر اپنے فکر و عمل کا احتساب کرنا چاہیے اور اس

اصول کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ حق و باطل کا معیار نہ تو کوئی شخص ہے — بجز ایک شخص کے جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور نہ ہی کوئی جماعت ہے — سوا ایک جماعت کے، جس کو دنیا اصحاب محمدؐ کے نام سے پکارتی ہے — اس لیے اس سلسلہ میں صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اور اصحاب رسول کا اسوہ ہی ہمارے سامنے ہونا چاہیے اگر ان چیزوں میں زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا گیا ہو کہ اس کا ہر سانس اقامت دین کے ذکر و فکر اور سعی و جہد میں بسر ہونا چاہیے تو پھر اس کے بعد اس کے اعتراف اور امتثال میں نہ تو کسی پیر و مرشد کی ارادت مانع ہونی چاہیے، نہ کسی شیخ و امام کی عقیدت، نہ تو کسی استاذ کا تلمذ اس ادائے فرض سے باز رکھنے کا حق رکھتا ہے اور نہ کسی جماعت کا تعصب۔ نہ کسی دیرینہ روش کی حمیت کو اس راہ میں آڑے آنا چاہیے نہ کسی فکر سابق کی عصبیت کو، کہ یہ سب چیزیں نفس کے حجابات اور شیطان کے فتنے ہیں اور قدرت نے ان کو انسان کے گوش و چشم پر صرف اس لیے پھیلا دیا ہے تاکہ اس کی حق پرستی کی آزمائش ہو۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان حجابوں کو چاک کر کے اور ان فتنوں کو کچل کر اپنے فرض کی پکار پر حرکت میں آجائے، ورنہ یاد رہے کہ اپنے ذاتی رجحانات کی پچ میں یا اپنے جماعتی افکار و مشاغل کی حمایت و عصبیت میں یا بزرگوں کی تقلید میں اس سے گریز کرنا اپنے آپ کو دانستہ نذرِ ہلاکت کرنا ہے، کسی بزرگ کا طرزِ عمل ہم کو خدا کی گرفت سے بچا نہیں سکتا۔ جب تک یہ رازِ حق دل پر نہ کھلا ہو، انسان کسی حد تک تو معذور تصور کیا جا سکتا ہے مگر جب حقیقت بے حجاب نظر آگئی اور دل نے اس کی صداقت کا اعتراف کر لیا تو بس یوں سمجھیے کہ اللہ کی حجت تمام ہو گئی۔ اس وقت اعتذار کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں، اب آگے یا تو آمادگی عمل اور کامرانی حیات ہے یا پھر انکار فرض و حصول نامرادی۔ کیونکہ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے انکار اور اعراض کرنا اس سنت فرعونی کی پیروی کرنا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ:-

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا

جب فرعون اور اس کے پیروؤں کے سامنے ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو نرا جادو ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کے دل ان نشانیوں کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی لوگ اس سنت کے پیرو ہیں اور — "ظلم و علو" نہ سہی — گروہ پرستی اور اکابر پرستی کے باعث جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ کے مرض میں مبتلا ہیں۔ کاش اس مرض کی خطرناکی کا احساس کیا جاتا، اور جو راہ اللہ نے ان پر کھول دی ہے اس پر چلنے سے کوئی تعلق مانع نہ ہوتا۔ ورنہ ہمیں خطرہ ہے کہ یہ اعتراف حق ان کے جرم کو کچھ ہلکا کرنے کے بجائے الٹا سخت کر دیگا۔

آخری گذارش

ابتدائے بحث سے لے کر یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ امت مسلمہ نے جس نصب العین کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی ہے اس کا حق ادا کرے، جن اصولوں پر اس کے وجود کی بنا رکھی گئی ہے، ان کو از سر نو اپنا مرکزِ عمل بنائے اور حالات زمانہ، مشکلات ماحول اور مصالح وقت سے صرف نظر کر کے، نیز نفس و شیطان کے اختراع کیے ہوئے حیلوں اور وسوسوں سے دل و دماغ پاک کر کے، اپنے چھوڑے ہوئے فرض زندگی کو سرانجام دینے میں لگ جائے۔ بلاشبہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کا ہر قدم کانٹوں سے بھرا ہوا ہے مگر رضائے حق کی بارگاہ تک جانے والی اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں۔ مقصد حیات کی اس توضیح اور تبلیغ کے بعد آخری گذارش یہ ہے کہ جن لوگوں کے تلوے ان کانٹوں کا خیر مقدم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے ان کے لیے آخری چارۂ کار جس کو برداشت کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ وہ جہاں ہیں وہیں قدم روکے کھڑے رہیں اور کم از کم

دوسرے پوچھنے والوں کو تو یہ ضرور بتا دیں کہ گو ہم ہیں اس راہ دشوار گذار کو طے کرنے کی ہمت نہیں مگر حق اور نجات کی شاہراہ ہے یہی۔ یہ اس لیے تاکہ کل اللہ تعالیٰ کے روبرو ترک فرض کے ساتھ ساتھ کتمان حق کے جرم میں بھی نہ ماخوذ ہوں۔ اور اگر بدقسمتی سے یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے قدموں کی طرح اپنی زبانوں کو بھی روکے رہیں مگر خدارا دوسروں کو اس راہ سے روکنے کا بوجھ اپنی گردن پر نہ لیں۔ یہ "صدعن السبیل" کی وہ لعنت ہے جس کے تصور ہی سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہوجانے چاہئیں۔ یہ بعینہ وہی روش ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں اشقیائے یہود نے اختیار کی تھی اور جس کے جواب میں حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا:۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

خدا نہ کرے کہ کوئی مسلمان اس حد تک آپ اپنی دشمنی پر کمربستہ ہوجائے اور خود تو اقامت دین کی جدوجہد سے جی چراتا ہی ہو، اوروں کو بھی اس سے باز رکھنے کا موجب بنے۔

اقامت دین کے اصول و مناہج

جب یہ بات واضح ہوچکی کہ ہماری زندگی کا نصب العین بہرحال اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے تو اب ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نصب العین کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ آیا اس کا کوئی مخصوص طریق کار ہے یا جس سمت سے چاہیں اس گول کی طرف بڑھ سکتے ہیں؟ سو جن لوگوں نے اجتماعیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا، ان کے لیے یہ معلوم کرلینا چنداں دشوار نہیں کہ ہر جماعت کا جو کسی خاص مقصد کو لے کر اٹھی ہو، جس طرح ایک مخصوص طریق فکر اور زاویۂ نگاہ ہوتا ہے اسی طرح اس کی تاسیس، تعمیر اور تنظیم کا انداز بھی مخصوص ہوتا ہے۔ اس طریق فکر، اس زاویۂ نگاہ، اور اس انداز تعمیر کی تعیین وہی مقصد کرتا ہے جس کو لے کر یہ جماعت اٹھی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو ایک نیشنل اسٹیٹ قائم کرنا ہو تو اس کے لیے ضرورت ہے کہ آپ اپنے مخاطبین کے دلوں کو وطن اور قوم کے عشق اور احترام سے معمور کریں، اپنے اوپر آپ حکمراں ہونے کا عقیدہ اور عزم پیدا کریں، پھر قومی ناموس کی قربان گاہ پر نثار ہوجانے کے لیے ان کے اندر سرفروشی کے جذبات پیدا کریں۔ جب یہ سب آپ کرلیں گے اور اس طرح کے آدمی آپ کے اردگرد جمع ہوجائیں گے تو سمجھیے کامیابی کی تمام شرطیں آپ نے پوری کرلیں۔ آپ کو یہ دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ میرے جھنڈے کے نیچے جو لوگ جمع ہیں وہ توحید کے متعلق، رسالت کے متعلق اور قیامت و جزائے عمل کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ ان کے اندر مذہب کی پابندی کتنی ہے؟ انھوں نے احسان و تقویٰ، عدل و انصاف، رحم و مروت، عفت و پاکدامنی، جود و سخاوت وغیرہ اوصاف سے اپنے کو کہاں تک آراستہ کرلیا ہے؟ ان میں سے کسی چیز کو دیکھنے کی حاجت نہیں، کیونکہ جو مقصد اور نصب العین آپ کے سامنے ہے، اس کے لیے یہ چیزیں سرے سے مطلوب ہی نہیں، بلکہ شاید کچھ مضر ہی ہوں، یہاں تو جو شے مطلوب ہے وہ صرف حریف کی غیر مشروط عداوت و مخالفت اور قوم، قومی اقتدار، قومی وقار اور قومی عروج کی انتہائی شیفتگی اور فداکاری ہے۔

اسی طرح اگر آپ ایک ملک میں کمیونزم کا اقتدار اور کمیونسٹ نظام قائم کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو پہلے وہاں کے باشندوں کے ذہنوں میں کمیونسٹ فلسفۂ زندگی، کمیونسٹ نظام معیشت و حکومت اور کمیونسٹ نظریۂ اخلاق کی خوبیاں اتارنی ہوں گی، سرمایہ داری کی

خلاف دلوں میں شدید نفرت پیدا کرنی ہوگی۔ مارکس اور لینن کے ساتھ وہ عقیدت پیدا کرنی ہوگی جو خدا اور پیغمبر کے لیے اہلِ مذہب کے دلوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور خدا، رسول، مذہب، آخرت، اخلاق اور اعمالِ صالحہ کے الفاظ کو خود غرض سرمایہ پرستوں کے ہتھکنڈے قرار دے کر ان کے نقوش اور اثرات کو ذہنوں سے مٹا کر، خالص مادی تصورِ حیات اور حیوانی تصورِ کائنات ان پر ثبت کرنا ہوگا۔ پھر جب آپ یہ بنیاد جما لیں گے اور یہ خیالات اور نظریات ایک معقول تعداد میں لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیں گے تو ان سب کو ایک جتھے میں منسلک کر کے ایک طرف باقی عوام کو اپنے پروپیگنڈے کے زور سے مسحور کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گے اور دوسری طرف خفیہ اور علانیہ، تمام ممکن ذرائع سے موجودہ نظامِ حکومت کے تخت کو الٹنے کی مہم شروع کر دیں گے تاکہ عوام کے ہاتھوں یہ تخت الٹ کر اشتراکی حکومت قائم ہو جائے۔

علیٰ ہذا القیاس، اگر ایک شخص منظم طریقہ پر رہزنی کرنا چاہتا ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے گا جو مضبوط جسم، بے خوف دل اور سفاک طبیعت رکھتے ہوں۔ ایسے آدمی اس کے کسی کام کے نہ ہوں گے جو نرم دل اور غارت گری و خونریزی سے متنفر ہوں۔ پھر اپنے مقصد کے مطابق لوگوں کو جب وہ حاصل کرے گا تو ان صفاتِ مطلوبہ کا ان میں مزید استحکام پیدا کرنے کی تدبیریں کرے گا۔ لوٹ مار کے انھیں گر سکھائے گا، اسلحے مہیا کرے گا تب کہیں جا کر اپنی مہم کا آغاز کر سکے گا۔

غرض دنیا کی ہر بامقصد جماعت کا یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو اس کے پیشِ نظر مقصد سے قلبی لگاؤ رکھتے ہوں اور لازماً ایسے ہی طریقِ کار اور ایسی ہی پالیسیاں اختیار کرتی ہے جو اس مقصد کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ یقیناً "مسلمہ" کہلانے والی جماعت اور قیامِ دین کا مقصد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی ایک خاص طریقِ کار ہونا چاہیے۔ آیئے دیکھیں وہ طریقِ کار کیا ہے؟

اس غرض سے جب ہماری نگاہ اٹھتی ہے تو فطرۃً وہ قرآن اور سنت ہی پر جا کر ٹھیرتی ہے۔ اور جب واپس لوٹتی ہے تو طمانیت کی ٹھنڈک لے کر لوٹتی ہے۔ جس طرح قرآن اور صاحبِ قرآن نے اقامتِ دین کے نصب العین کو پوری تشریح اور وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے، اسی طرح اس کے طریقِ کار کے بارے میں بھی کسی حجاب کو حائل نہیں ہونے دیا ہے۔ بلکہ ایک روشن و بینا کر دینے والا طریقہ قرآن و سنت کے صفحوں میں اسی طرح نمایاں نظر آتا ہے جس طرح اندھیری راتوں میں آسمان کے سینہ پر کہکشاں۔ قرآن، قرآن کے لانے والے اور قرآن کے بھیجنے والے تینوں نے اس طریقِ کار کی طرف رہنمائی کی ہے۔ جو کہنے میں تو تین الگ الگ وجود ہیں مگر زیرِ بحث مقصد کے اعتبار سے تینوں دراصل ایک ہی ہیں۔

قرآنی اصول و نکات

قرآن کو غور سے پڑھیے اور اس کی تمام تعلیمات کو بخوبی طور پر سامنے رکھیے تو بڑی آسانی اور وضاحت کے ساتھ وہ اصول و نکات ہاتھ آ جاتے ہیں جن پر اقامتِ دین کی جدوجہد کی جانی چاہیے۔ اور یہی اصول و نکات دراصل تعلیماتِ قرآن کا مغز ہیں، یعنی از روئے حقیقت سارے قرآن کی بحث کا مرکز یہی ایک مقصد ــــ مقصدِ اقامتِ دین ــــ ہے اور اس کی ساری تفصیلات اسی مقصد کے اصول کی شرح ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو اجاگر اور اس مغز کو حاصل کرنے کے لیے قرآن کے چشمۂ حیوان کو اچھی طرح کھنگالنے کی ضرورت ہے، جس کے لیے کافی وقت درکار ہے۔ اس لیے ہم اس موقع پر قرآن کی صرف ان آیتوں کی طرف توجہ دلائیں گے جو مسلسل ایک ہی دو رکوع میں درج ہیں اور ہمارے بحث کے لحاظ سے گویا پورے قرآن کا خلاصہ ہیں یعنی اقامتِ دین کے جو اصول و نکات

قرآن کے سیکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کیے گئے ہیں وہ یہاں چند سطروں میں سمیٹ دیے گئے ہیں۔ یہ آیتیں اقامت دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصولوں ہی کی وضاحت کرتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ان اصولوں کی ترتیب اور اس نصب العین کے فطری ارتقا کے تدریجی ادوار و منازل کی نشاندہی بھی کرتی ہیں، اس لیے ان آیتوں کو ایک بار ترتیب کے ساتھ پڑھ لیجیے:-

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِیعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَیْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَیْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا …… وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ یَدْعُونَ إِلَى الْخَیْرِ وَیَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِینَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَیِّنَاتُ…

(آل عمران ۱۰۲)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو تم پر ہوا ہے، جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دل باہم جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے…… اور چاہیے کہ تم ہی میں ایک گروہ ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکتا رہے۔ ایسے ہی لوگ فلاح یاب ہوں گے۔ اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلافات میں مبتلا ہو گئے۔

ان آیات کا زمانۂ نزول مدینہ کی ابتدائی زندگی یعنی سنہ ۲ھ یا سنہ ۳ھ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے ابتدائی مرحلوں سے گذر رہی تھی۔ عین اس زمانہ میں یہ آیات کریمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامت دین اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں، اس ربانی پروگرام پر غور کیجیے تو بالترتیب اس کے حسب ذیل تین اجزا یا تین نکات نظر آتے ہیں:

(۱) التزام تقویٰ (۲) اعتصام بحبل اللہ (۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

ان نکات سہ گانہ کو تفصیل کی روشنی میں دیکھیے:-

(۱) التزام تقویٰ

پہلی چیز جو اقامت دین کے سلسلہ میں مطلوب ہے، اور جس کو اس قصر کا سنگ بنیاد کہنا چاہیے اِتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ہے۔ یعنی ہر وہ فرد جو ایمان کا مدعی ہو اور جو اس فرض کو ادا کر کے اپنے سر سے بندگی کا ذمہ اتارنا چاہتا ہو، اس کے لیے یہ لازم ہے کہ اللہ کا "تقویٰ" اختیار کرے اور تا دم واپسیں، ہر آن اور ہر لحہ، ایک "مسلم" کی طرح زندگی بسر کرے۔ تقویٰ کا مفہوم، جو قرآن نے متعین کیا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس نے جو حدیں قائم کر دی ہیں ان کی پاسداری کی جائے۔ اس کے کسی امر کی عدم تعمیل سے بھی ڈرا جائے اور کسی نہی کے ارتکاب سے بھی خوف کھایا جائے۔ اور مسلم کے معنی ہیں فرمانبردار اور اطاعت کیش کے، یعنی وہ شخص جس نے اوامر الٰہی کے سامنے رضاکارانہ اپنی گردن جھکا دی ہو۔ تو گویا اقامت دین کے پروگرام کا پہلا نکتہ یہ ہوا کہ انسان سب سے پہلے خود اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرے، خوف و رجا کی ساری نیازمندیاں بس اسی ایک ذات کے لیے مخصوص کر دے اور تسلیم و تعظیم اور تذلل و تواضع کے تمام جذبات اسی کی رضا جوئی میں نثار کر دے، تمام اطاعتوں سے منہ موڑ کر اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔

اپنے نفس کو ان تمام رذائل سے پاک کرے جو ناخوشنودی رب کے موجب بنتے ہیں اور ان تمام محاسن سے آراستہ کرے جو رضائے الٰہی کے باعث ہیں۔ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی غلام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجا آوری میں نہ تو لیت و لعل کرے اور نہ دل تنگ ہو۔ اپنی نگاہ کو رضائے حق اور امتثال امر رب پر پوری طرح جمائے رکھے خواہ کتنی ہی مخالفتیں، مصیبتیں، ناسازگاریاں اور دل شکنیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں کہ دراصل یہ چیزیں مشکلات و مصائب نہیں ہیں بلکہ اتباع حق اور التزام تقویٰ کی وہ امتحان گاہیں ہیں جن سے گذرے بغیر کسی مدعی ایمان کا ایمان و اتقا خدا کے ہاں سند اعتبار اور شرف قبول نہیں حاصل کرتا جیساکہ قرآن کا فیصلہ ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الخ

(بقرہ - ۱۹)

ہم ضرور تم کو (یعنی تمہارے ادعائے ایمان کو) خطروں اور فاقوں اور تمہارے مال و جان اور پیداوار کے نقصانوں کے ذریعہ آزمائیں گے۔ اور اے نبی! ان لوگوں کو کامرانی کا مژدہ سنا دو جو ان خطرات و نقصانات کو صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کر لیں۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ

(عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں پرکھا نہ جائے گا؟ حالانکہ (یہ آزمائش ہماری ہمیشہ کی سنت ہے اور) ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے۔ سو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے ہیں اور کون جھوٹے۔

پس ان چیزوں سے گھبرانے کے بجائے ان کا خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کرنا چاہیے ورنہ وہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہو سکتا جو ان عوائق کے آگے سپر ڈال دے اور وہ سینہ تقویٰ کے نور سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا جو اس آزمائش کی ہمت نہ رکھتا ہو۔ بڑے دھوکے میں ہوگا وہ شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے جانی اور مالی، گروہی اور طبقاتی، قومی اور وطنی مفادات کا بچاؤ پہلے کر لینے کی فکر کرے اور اتباع حق کو جان و مال کی کامل حفاظت کے ساتھ مشروط رکھتا ہو۔ ایسے شخص کی زبان پر اسلام، اور اس کی شکل و صورت میں تقویٰ تو ہو سکتا ہے مگر اس کا باطن ان طائران قدس کا آشیانہ نہیں بن سکتا۔ غرض ابتلائے مومنین اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے، اور اسی سنت کو پوری کرنے کے لیے اس نے اسلام اور اتقا کا راستہ مشکلات اور مصائب کی چٹانوں سے بھر رکھا ہے اس لیے جو شخص اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ کے فرمان الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو اس کو ان چٹانوں سے ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

(۲) اتحاد و تنظیم

اس پروگرام کی دوسری دفعہ یا دوسرا نکتہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا کے الفاظ میں بیان ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اہل ایمان جو اپنی انفرادی اصلاح و تزکیہ میں کوشاں اور احکام الٰہی و حدود خداوندی کی پابندی میں سرگرم عمل ہوں، مل کر ایک مضبوط اور منظم جماعت بن جائیں۔ اور ان کو باہم جوڑنے اور متحد کرنے والی چیز نہ تو کوئی نسلی رشتہ ہو، نہ کوئی وطنی مفاد، نہ کوئی معاشی و سیاسی غرض ہو، نہ کوئی دنیوی اور مادی مقصد، بلکہ صرف اللہ کی "رسی" یعنی وہ کتاب ہو جس کو قرآن کہا جاتا ہے، وہ شریعت ہو جس کی پیروی کا ہر مومن نے عہد کیا ہے، وہ دین ہو جس کی اطاعت و اقامت کے لیے بندگان خدا کی آفرینش ہوئی ہے۔ پس یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام کے نزدیک نفس اتحاد ہی کوئی مطلوب و محبوب شے ہے۔ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کو مطلوب نہیں بلکہ اس کی نظروں میں وہ صد درجہ مردود و مبغوض ہے اور

اس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ اس اتحاد و ائتلاف کا ہے جس کا شیرازہ اتباع حق اور اقامت حق ہو۔

اقامت دین کا یہ نکتہ یعنی اتحاد امت، اگر ذرا غور کیجیے تو، پہلے نکتہ سے کوئی بالکل الگ اور متغائر شے نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ایک طالب علم کو اس کی اپنی طبیعت مجبور کرتی ہے کہ اپنے رفقائے درس سے بے تکلفی، دل بستگی اور الفت و محبت رکھے۔ ایک صاحب علم کی فطرت چاہتی ہے کہ ارباب علم و دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف کھنچ اٹھنے سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتا اور اگر کسی طالب علم کو اپنے رفقا سے، کسی صاحب علم کو علما و افاضل سے، کسی رنگین مزاج کو اپنے ہم مشربوں سے کوئی گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں طالب علم، صاحب علم اور رنگین طبع نہیں ہے۔ یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح میں جاذبہ جنسیت کہا جاتا ہے اور یہی جاذبہ جنسیت اہل تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرتا ہے۔ ایک وہ انسان جو خدا پرستی اور اتباع احکام قرآنی کے جذبات سے سرشار ہو، لازمی طور پر ان لوگوں کی طرف کھنچے گا جو اسی کی طرح اتباع حق اور تقویٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، یہ ممکن نہیں ہے کہ دو دلوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو لیکن وہ آپس میں کٹے ہوئے ہوں، ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تقویٰ کی صورت تو ان میں ہے اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے۔ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے غیر بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہی راز ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف کہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کے الفاظ سے کی گئی ہے، اور کہیں رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ان کی علامت فارقہ بتلائی گئی ہے، کہیں اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ان کا نشان امتیاز ٹھیرایا گیا ہے۔ گویا اسلام کے مدعیوں اور پیروؤں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔ پھر دوسری طرف اس رنگ وحدت کو برقرار اور شوخ سے شوخ تر کرنے کے لیے منفی پہلو سے بھی اس پر روشنی ڈال دی گئی ہے اور تصریح کے ساتھ تمام اہل ایمان کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَکُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (توبہ۔ ۳)

اے ایمان لانے والو! اگر تمھارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو اپنا ولی نہ بناؤ اور جو ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچا مومن اور متقی، دیگر اتقیا اور صالحین سے بُعد اور کشیدگی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح وہ فساق و فجار سے رابطہ قلبی بھی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے یگانے ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس امکان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں:۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ (مجادلہ۔ ۳)

تم کسی ایسے گروہ کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، ان لوگوں سے الفت و محبت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی عداوت اور مخالفت پر کمربستہ ہوں، خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ، بیٹے یا بھائی یا اہل خاندان کیوں نہ ہوں۔

غرض ایک اصول اور نصب العین کی علمبردار پارٹی جس طرح اپنے ارکان کو ڈسپلن کی سخت بندشوں میں باندھ کر رکھتی ہے

اسی طرح قرآن نے مداہنت کے تمام رشتوں کو کاٹ کر ایک مرکز سے جڑ جانے کا مطالبہ کیا ہے، چنانچہ یہی بات اس نے اتحاد و ائتلاف کی فہمائش کے ساتھ بھی واضح کر دی ہے اور کھلے لفظوں میں فرما دیا ہے کہ خبردار ان بدبخت لوگوں کی روش نہ اختیار کرنا جو بیّنت الٰہی کے انوار رکھتے ہوئے بھی افتراق و تشتت کی تاریکیوں میں کھو گئے (وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ)

(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اقامت دین کے پروگرام کی تیسری دفعہ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ کے ارشاد الٰہی میں واضح کی گئی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادی طور پر اپنی ذات کے اوپر دین حق قائم کرنے اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بننے کے ساتھ ساتھ اس "خیر و معروف" کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود قبول کیا گیا ہے اور اس منکر کو حسب استطاعت اور حسب مواقع کہیں بزور شمشیر کہیں بذریعہ زبان، اور کہیں بواسطۂ استکراہ قلب، مٹا ڈالنے کی مسلسل سعی جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے، یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشہ میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اثر و اقتدار باقی نہ رہ جائے۔ جس طرح اقامت دین کی دوسری دفعہ یعنی افراد امت کا اجتماع و اتحاد، پہلی دفعہ یعنی انفرادی صلاح و تقویٰ کا لازمی تقاضا ہے اسی طرح یہ تیسری دفعہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اس کا عین مقتضائے فطرت ہے۔ نہ کوئی خارجی اور غیر متعلق اور مختلف المزاج حکم۔ محبت کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ گرد و پیش انہی احوال و مناظر کی کارفرمائی ہو جو محبوب کو پسند خاطر ہوں، وہ دل سوز محبت سے آشنا نہیں کہا جا سکتا جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا ہوا دیکھے اور دیکھ کر سیماب وار تڑپ نہ اٹھے۔ اس لیے خدا کی محبت اور حق کی جاذبیت، کہ روح تقویٰ عبارت ہے انہی چیزوں سے۔ ایک خدا پرست اور "متقی و مسلم" کو چین سے بیٹھنے نہیں دے سکتی جب تک کہ صفحۂ ارض پر اس کی نگاہوں میں چبھنے کے لیے ایک باطل اور ایک منکر بھی موجود ہو۔ اس کے اسلام اور ایمان کے یہ شے منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین الٰہی کے حلقۂ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرماں بردار دیکھے اور ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کرے۔ پس اقامت دین کا فرض ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ پیروان دین حنیف کی جمعیت امر بالمعروف کے فرض کو سرانجام نہ دے رہی ہو۔ اور اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ کی منزل طے نہیں ہو سکتی اگر اہل ایمان خود اتباع احکام الٰہی کرنے ہی پر اکتفا کر لیں اور ان کو اس سے کوئی بحث نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر جا رہی ہے۔

اس اقتضائے ایمانی کے علاوہ امر بالمعروف کی ایک خالص سیاسی ضرورت بھی ہے۔ فطرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہی زندہ رہتا ہے جو اقدام کی عملی جرأت رکھتا ہو، بقا اور ارتقا صرف جارحانہ پیش قدمی میں ہے۔ زبردست سے زبردست لشکر بھی اپنے آپ کو شکست کی ذلت سے نہیں بچا سکتا اگر وہ دشمن کے خلاف جارحانہ حملے کرنا نہ جانتا ہو۔ کوئی تحریک زوال و انحطاط کے انجام سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اگر وہ اپنی داخلی تعمیر و تنظیم کے ساتھ ساتھ اپنے بیرونی ماحول کی تسخیر کی مہم سے غافل ہو۔ اسی طرح وہ جماعت جو اللہ کے دین کی علمبردار ہو، اس وقت تک زندگی اور پائندگی کا حق نہیں ہو سکتی نہ ہی اس کے اپنے اوپر دین کا قیام باقی اور مستحکم رہ سکتا ہے جب تک کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ہاتھوں سے طاغوتی مورچوں پر مسلسل جارحانہ حملے نہ کرتی رہے۔

جس طرح ایک جاندار کا جسم محنت و مشقت کے بعد اپنے بعض اجزا کے تحلیل ہو جانے کی وجہ سے کمزور ہوتا رہتا ہے اور اس کمزوری

کو دور کرنے اور اصل طاقت عزیزی کو بحال رکھنے کے لیے غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ جسم کی رگوں میں تازہ خون پہنچا کر اس کی زائل شدہ قوت کو واپس لاتی رہیں۔ اسی طرح اقامت دین کا نصب العین رکھنے والی جماعت کی قوت خیر و تقویٰ کو بقا و استحکام اور مزید نشو و نما دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی رگوں میں امر بالمعروف کے ذریعہ خدا پرستی کا خون تازہ بتازہ داخل کیا جاتا رہے، ورنہ رفتہ رفتہ اس میں روح تقویٰ مضمحل ہوتی جائے گی اور خود اس کے اوپر سے دین کا اقتدار ڈھیلا ہوتا جائے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کائنات طبعاً متحرک پیدا کی گئی ہے، سکون و جمود سے اس کی فطرت ناآشنا ہے، اگر اس کو آگے کی طرف بڑھنے کا موقع نہ ملے گا تو یقیناً پیچھے ہٹنے لگے گی، کوئی شے کسی ایک حالت پر تھم کر نہیں رہ سکتی، ضرور ہے کہ شئی کسی سمت حرکت کرتی رہے اس لیے قیام دین کی تحریک اگر آگے نہ بڑھے گی تو پیچھے ہٹنا شروع کر دے گی۔ جب آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ رو پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کی وجہ پوچھی تو کہا "آج تک ہمارا دین ترقی کے زینے طے کرتا رہا لیکن اب جب کہ وہ اپنی حد کمال کو پہنچ گیا ہے، اس کے انحطاط کا آغاز ہوگا، کیونکہ جو شے بھی کامل ہو جاتی ہے وہ ناقص ہو کر رہتی ہے" آنحضرت صلعم نے فرمایا "بیشک تم نے بہت صحیح بات کہی"۔ پس نہ صرف اس لیے کہ فریضۂ اقامت دین کا امر بالمعروف ایک لازمی عنصر ہے، بلکہ اس لیے بھی، کہ یہی امر بالمعروف اسلامی جماعت کے جوہر ایمان و اتقا کا محافظ ہے۔ اس کو اس فرض کی ادائگی سے کوئی چارہ کار نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ قرآن مجید نے اقامت دین کے یہ تین نکات پیش کیے ہیں اس لیے اس فرض کو ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان تینوں نکات پر پورے عزم و استقلال کے ساتھ عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ان میں کوئی اس قسم کی زمانی ترتیب ہے کہ جب پہلے نکتہ پر کامل طور سے عمل ہو لے تب دوسرے کی بسم اللہ کی جائے اور جب دوسرے کا کمال اتباع معرض وجود میں آئے تو تیسرے کو سامنے لایا جائے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں نکات پر بیک وقت عمل شروع ہو جانا چاہیے اور اس سے پہلے اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو صرف ایک چیز کی ہے، یعنی ذہن کی پوری یکسوئی اور قلب کی سچی شہادت کے ساتھ لا الٰه الا الله اور محمد رسول الله پر ایمان لانا۔ اس اقرار و اعتراف کے بعد جب ایک شخص يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کے زمرۂ مخاطبین میں آگیا تو قرآن بیک وقت اس کے سامنے یہ تینوں مطالبے رکھ دیتا ہے اور اس کے لیے اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق ان تینوں نکات پر ایک ساتھ عمل کرنا لازمی ہو جاتا ہے کیونکہ ان تینوں نکات میں عمل کے لحاظ سے تفریق کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں اور حقیقت یوں ہے کہ دوسرے اور تیسرے نکتے بھی پہلے ہی نکتہ کے اجزا یا یوں کہیے کہ اسی کے تکملات ہیں نہ کہ اس سے علیحدہ مستقل بالذات نکتے۔ اس طرح دوسرے اور تیسرے نکتوں پر عمل پیرا ہونا دراصل پہلے ہی نکتہ کے اتباع کی تکمیل ہے اور جب تک ان دونوں پر عمل نہ ہو لے، پہلے پر عمل کا حق ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک کسی کل کے تمام اجزا موجود نہ ہو لیں وہ کل اپنی کامل شکل میں وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔

اس دعویٰ کی صحت معلوم کرنے کے لیے کسی بڑی بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں بجز اس کے کہ تقویٰ کے صحیح مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ تقویٰ ان تمام حدود کی ٹھیک ٹھیک پابندی کا نام ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے میدان زندگی کے ہر چہار اطراف میں قائم کر دی ہیں اور آدمی اس وقت تک متقی نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات میں ــــــ خواہ ان کا تعلق براہ راست اپنے نفس اور اپنی انفرادی زندگی سے ہو، خواہ منزلی اور معاشرتی

زندگی سے، خواہ سیاسی اور اجتماعی زندگی سے ــــ غرض ہر جگہ اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے احکام کا اتباع اور اس کی قائم کی ہوئی حدود کی حفاظت اور نگرانی نہ کرے۔ اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اس امر سے انکار کرنا کہ اقامت دین کے باقی دو نکات دراصل پہلے ہی نکتہ کے مقتضیات اور تکملات ہیں، ایسا ہی ہے جیسے کوئی دو دو ل کے چار ہونے سے انکار کر دے۔ کیونکہ اپنے نصب العین زندگی کی خاطر تمام اہل ایمان کا باہم متحد رہنا اور امر بالمعروف میں اشتغال دائمی رکھنا بھی تو منجملہ انہی احکام و حدود کے ہے جن کی پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ قرآن کی ان آیتوں کو غور سے پڑھیے:-

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (توبہ - ۱۵)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔

(۲) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (حجرات - ۱)

مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان (اختلاف و عناد پیدا ہونے کی صورت میں) صلح کرا دو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ اس کی رحمت سے سرفراز ہو سکو۔

(۳) ...... وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (روم - ۴)

...... اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے اور اب ہر کوئی اپنے اپنے خیالات و افکار میں مست ہے۔

ان میں سے پہلی آیت میں سچے مومنوں سے جڑ کر رہنے کو اور دوسری میں دو باہم پھٹے ہوئے مومن دلوں کے دوبارہ جوڑ دینے کو "اتقا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور تیسری آیت میں اس رشتۂ اخوت و یگانگت کے فقدان کو بالکل شرک کا مظہر قرار دے کر اس حقیقت کے چہرے سے آخری حجاب بھی دور کر دیا گیا ہے کہ ایمان و تقویٰ کے تحقق کے لیے جماعتی اتحاد و مرکزیت شرط لازم ہے۔ اس اصل دینی کی پوری وضاحت اور اہمیت دیکھنی ہو تو ان آیات کے ساتھ ان احادیث کو بھی سامنے رکھ لینا چاہیے جن میں جماعت کے لزوم پر کفر و ایمان تک کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اور صاف طور سے بتا دیا گیا ہے کہ اس جماعت مومنین سے، جو "الجماعت" ہے اور جو صحیح معنوں میں دین حق کی علمبردار اور رسول کے مشن کی حامل اور اصحاب رسول کے نقوش قدم کی پیرو ہے، الگ ہونے والا دائرۂ اسلام سے خارج، اس کی زندگی کافرانہ، اس کی موت جاہلیت کی موت اور اس کا انجام آگ کا انجام ہے۔

اس کے بعد چند دوسرے نصوص ملاحظہ ہوں جن میں امر بالمعروف کو تقویٰ کا کام قرار دیا گیا ہے:-

...... يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ...... وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ (آل عمران - ۱۲)

یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں ......اور اللہ متقیوں سے واقف ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (توبہ - ۱۶)

اے ایمان لانے والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر درشتی محسوس کریں، یاد رکھو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

پہلی آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو صفاتِ متقین اور اوامرِ تقویٰ میں شمار کیا گیا ہے اور دوسری میں نہی عن المنکر کی ایک خاص شکل یعنی قتالِ کفار کو تقویٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ - ۹)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے "ولی" ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اس آیت نے دونوں چیزوں کو اجزائے ایمان کے تحت ایک ہی ساتھ جمع کر دیا ہے اور باہم جڑ کر ایک منظم پارٹی کی طرح رہنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا مومنین کا نشانِ امتیاز اور مقتضائے ایمان قرار دیا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں اس وہم کی تاریکی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ جب تک اقامت دین کے پہلے نکتہ پر پورا پورا عمل نہ ہولے اور انسان کا باطن نورِ تقویٰ سے بخوبی منور نہ ہولے اس وقت تک اس کے لیے دوسرے اور تیسرے نکات کی طرف توجہ کرنے کی اجازت نہیں۔ در اصل یہ وہم ایک زبردست حجاب ہے جو ہمارے نیکوکار افراد کی بصیرتوں پر پڑا ہوا ہے جس کا ظاہری پہلو یقیناً بڑا ہی جاذبِ نظر اور روحانیت نواز دکھائی دیتا ہے مگر اس کا باطن اوہامِ باطلہ اور فریبِ جہل سے یکسر مملو ہے۔ جب ایک شخص متقی اسی وقت ہو ہی سکتا ہے جب وہ دیگر اہلِ ایمان سے اتحاد و ولایت کا رشتہ جوڑ لے اور بقدرِ امکان امر بالمعروف کے فرائض سرانجام دیتا رہے تو یہ بات کتنی لایعنی ہوگی کہ آدمی پہلے متقی کامل بن لے تو "اعتصام بحبل اللہ جمیعاً" اور "امر بالمعروف" کی مہم کا آغاز کرے۔ ان تینوں نکات کی مثال تو بالکل ایک درخت کے اجزا کی سی ہے۔ جس طرح بیج سے ننھا سا پودا اگتے ہی اس میں جڑ، تنہ اور پتے کی تخلیق ہو جاتی ہے اور تینوں ایک ساتھ نشوونما حاصل کرتے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ بیج سے جڑ نکل کر خوب موٹی تازی ہولے تب اس میں سے تنہ نکلے اور جب تنہ اپنی پوری بالیدگی کی حد کو پہنچ لے تو اس میں سے پتیاں نکلنی شروع ہوں، یہی تخمِ ایمان سے پھوٹنے ہوئے شجرِ اسلام کا حال بھی ہے۔ طہارتِ نفس یعنی انفرادی تقویٰ کو اس شجرۂ مبارکہ کی جڑ اور اتحاد و ائتلاف کو اس کا تنہ اور امر بالمعروف کو اس کی پتیاں سمجھنا چاہیے۔ زندہ جڑ کا فطری تقاضا یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اس میں سے شاخیں، اور شاخوں سے پتیاں نکلنی شروع ہوں۔ اسی طرح نفسِ انسانی میں طہارت اور روحِ تقویٰ کا وجود اس امر کو مستلزم ہے کہ اس میں سے اتحادِ امت اور امر بالمعروف کی مساعی کا ظہور ہو۔

قرآن کے طریقۂ نزول سے رہنمائی

اقامت دین کا یہی وہ طریقۂ کار ہے اور اس کے یہی وہ اصولی نکات ہیں جو قرآن حکیم کی تکمیلی ترتیبِ نزول سے بھی مستنبط ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں ان میں صرف دو چیزوں کی تعلیم تھی، ایک تو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت وغیرہ کی تعلیم دوسری اقامت صلوٰۃ اور محاسن اخلاق کی تعلیم جس طرح ایک کسان اپنی زمین میں مہینوں ہل چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بیج کو روئیدگی بخشنے کے لیے بالکل تیار ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ جو بیج بھی اس میں ڈالتا ہے، فوراً اگ آتا ہے، اسی طرح تیرہ برس کی طویل مدت تک اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو صرف ایمان کی، اور ذکر و نماز اور اسی طرح کے چند بنیادی امور کی تعلیم و تلقین کرتا رہا۔ چنانچہ بالکل ابتدائی سورتوں مثلاً سورۂ مزمل سورۂ مدثر وغیرہ کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے لیے، جو پیغمبر اور اس کے حواریوں پر ڈالا جانے والا تھا، کس طرح ایمان کو دلوں میں اتارنے کے ساتھ ساتھ نماز اور ذکرِ الٰہی، صبر اور توکل اور انابت و خشیت کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ اس لیے تاکہ دل اس بوجھ کو سہارنے کے لیے تیار ہو جائیں جو آگے چل کر ان پر پڑنے والا ہے اور طاعت و انقیاد کے لیے اس حد تک آمادہ ہو جائیں کہ جس وقت جو حکم بھی اوپر سے آئے بلا چون و چرا اس کی تعمیل کے لیے اپنی جان و مال حاضر کر دیں۔ اور شہادتِ حق و اقامتِ دین کا جو فرض ان پر عائد کیا جانے والا تھا اس کو ادا کرنے کے لیے مستعد

ہو جائیں جب انفرادی حیثیت سے یہ تزکیہ قابلِ اطمینان حد تک پہنچ چکا تو زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق حدود و احکام کا نزول شروع ہوا اور وہ سورتیں نازل ہونے لگیں جن میں ایک منظم پارٹی کی حیثیت سے مسلمانوں کو سامنے رکھ کر ہدایتیں دی گئی تھیں۔ اس ضمن میں وہ احکام بھی آئے جو تمام اہل ایمان کو ایک جماعت بن کر رہنے کی ہدایت پر مشتمل تھے اور وہ احکام بھی جو ایک جماعت کی تطہیر و تمحیص کی ہدایات سے متعلق تھے۔ مدنی سورتوں کو پڑھیے تو یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے گی۔ پھر امر بالمعروف کا حکم بھی حالات کے لحاظ سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ نازل ہوتا رہا۔ مکی زندگی میں یہ حکم زبانی تبلیغ و ارشاد تک محدود رہا۔ مدینہ میں زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے کام لینے کی بھی تاکید کی گئی لیکن ایک عرصہ تک حالات کے لحاظ سے یہ کام صرف مدافعت کی حد تک محدود رہا۔ پھر فتح مکہ کے بعد جب عرب میں کفر نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں کو اطمینان اور بے خوفی کی فضا میسر ہوئی اور وہ ایک بالادست قوت کی حیثیت میں ہو گئے، تو تمام کفار و مشرکین سے برائت کا اعلان کر کے دفاع، اقدام سے بدل دیا گیا اور وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ فرما کر اس وقت تک کے لیے اہل ایمان کو امر بالمعروف یعنی حق کی اشاعت اور اقامت کا ذمہ دار بنا دیا گیا جب تک کہ یہ دنیا باقی ہے اور اس میں حق سے باطل، معروف سے منکر، ایمان سے کفر اور دین الٰہی سے دین طاغوت حریفانہ نبرد آزمائی کے لیے موجود ہے۔

اسوۂ رسول اقامت دین کا یہ طریق کار اور یہ اصولی نتائج تو ہمیں قرآن سے حاصل ہوتے ہیں، اب اگر آپ معلم قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ وہی اصولی نکات جو قرآن کے اندر الفاظ کے جامہ میں تھے، یہاں واقعات اور تجربات کی شکل میں موجود ہیں اور نبی اکرمؐ نے ٹھیک انہی لائنوں پر امت کی تاسیس اور تربیت و تنظیم کی۔ سب سے پہلے تو آپ نے عرب کے اس کفر زار میں، جس کا چپہ چپہ دین طاغوت کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا، ایک آواز بلند کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ انسان اپنے تمام جذبات و میلانات اور اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات کو اس ذات واحد کے تابع فرمان بنا دے جس کے سوا اس زمین پر کسی کو اپنی مرضی منوانے اور اپنا حکم چلانے کا استحقاق نہیں۔ یہ نامانوس آواز جن بہرے کانوں سنی گئی اور اس کو دبانے کے لیے جن انسانیت سوز مظالم سے کام لیا گیا ان سے کوئی صاحب نظر ناواقف نہیں ہے، سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں، وطنی مفاد نے آڑے آنے کی کوشش کی، وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مصلحتوں نے دامن پکڑا، مشکلات نے راستہ روکا، ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا، مگر اللہ کے اس بندہ نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہیں آنے دی اور حالات زمانہ، رفتار واقعات اور مستقبل کے امکانی خدشات، غرض ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس حقیقت کو دوسروں پر برابر کھولتا رہا جو خود اس پر کھل چکی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے عقیدۂ توحید اور نظریۂ زندگی میں تن تنہا تھا اس نے ایک لحظہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کیا کہ اس عقیدہ اور نظریہ کو چھپائے رکھے اگرچہ پوری دنیا اس کی زبان بندی پر کمربستہ تھی۔ بالآخر اس دعوت حق نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور ان لوگوں میں سے جن کے اندر قبول حق کی صلاحیتیں ابھی زندہ تھیں، ایک ایک دو دو کر کے آپ کے حلقۂ اطاعت میں آنے لگے۔ آپ نے ان کے قلوب و اذہان میں ایک خدا کی غلامی اور پرستش کا گہرا نقش بٹھایا اور اصولی طور پر ان کو یہ بات سمجھا دی کہ رضا صرف اس کی چاہو جس نے تمہیں زندگی اور سامان زندگی عطا کیا اور حکم صرف اس کا مانو جس کے سوا سب تمہاری ہی طرح عاجز و درماندہ ہیں۔ یہ نقش بٹھانے کے بعد ان کو زندگی کے احوال و مسائل میں بتدریج وہ احکام سنانے شروع کیے جو احکم الحاکمین کی طرف سے آپ پر نازل ہوتے رہے اور ہر حکم پر خود عمل کرتے ہوئے ان کو اس پر عمل کرنے کی تعلیم دی، جاہلیت کی کثافتوں سے ان کے باطن پاک کر کے ان میں مکارم اخلاق کی تخم ریزی کی اور اپنی بے مثال قوت تربیت سے ان کے دلوں کو ایک خدا کی بندگی کا ایسا عقیدت کیش بنایا کہ اعدائے توحید نے اپنے ترکش ظلم و انتقام کے سارے تیر خالی کر دیے مگر کسی بندۂ مومن کا دل توحید کے نشہ سے خالی نہ کر سکے۔ اس تربیت اور تزکیہ کے ساتھ ساتھ آپ ان سب لوگوں کو، جو آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے جا رہے تھے، ایک خاندان کے افراد کی طرح باہم جوڑتے گئے۔ یہ جوڑنا اتنا پائیدار تھا کہ

بھائی بھائی کے رشتے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ پھر اسی کے ساتھ توحید کی دعوت و تبلیغ نہ صرف یہ کہ باقی رہی بلکہ اس کا دائرہ گھر سے خاندان، خاندان سے قبیلہ، قبیلہ سے شہر اور شہر سے اطراف ملک تک وسیع ہوتا گیا۔ آنحضرت صلعم بھی اور آپ کے اتباع بھی سب کے سب دین حق کی تبلیغ و اشاعت میں ہر دم مصروف رہتے اور جس کسی کو شرک و کفر کی نجاستوں میں آلودہ پاتے اسے پاک کر کے ایک خدا کا پرستار، دوسروں کا آزاد اور خدا کا غلام اور ایک حاکم علی الاطلاق کا محکوم بنانے کی کوشش کرتے رہتے، جس بدی کو دیکھتے اس کو مٹانے کی تدبیر کرتے، اور کفر و فسق کے جس طوفان سے رحمت حق نے انھیں نجات دی تھی اس میں دوسروں کو ڈوبتے دیکھنا انھوں نے کبھی گوارا نہ کیا۔ یہ جد و جہد برابر تیرہ برس تک مکہ میں جاری رہی، پھر وہ وقت آیا جب دشمنان حق کے لیے اس دعوت توحید کی مقبولیت اور روز افزوں ترقی ناقابل برداشت ہو گئی اور انھوں نے آنحضرت صلعم کے قتل کا انتظام کر کے اس دعوت کو فنا کر دینا چاہا تو داعی حق اور اس کے پیروان صفا کیش نے مکہ کو خیرباد کہہ کر مدینہ کو اپنے مشن کا مرکز بنایا اور وہاں سے اس نصب العین کی خاطر جد و جہد شروع کر دی جس کو وہ اپنا مقصد زندگی بنا چکے تھے، اور جب کفار نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور ادھر اہل ایمان کی ایک منظم جمعیت بھی فراہم ہو چکی تھی تو بدی کے استیصال اور حق و عدل کی بقا کے لیے تلوار اٹھائی گئی۔ ایک مدت تک تو طاغوتی طاقتیں خود بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور ہوتی رہیں اور مسلمان صرف مدافعت کرتے رہے۔ اس دوران میں وہ خوف، دہشت، بے اطمینانی اور طرح طرح کے خطرات برداشت کرتے رہے اور جان و مال کی ہر ممکن قربانی کر کے حق کی شہادت دیتے رہے، یہاں تک کہ حدود عرب میں کفر کی شوکت ٹوٹ گئی اور طاغوت کا علم سرنگوں ہو گیا، اس وقت مسلمانوں کا قلب اس تائید و نصرت الٰہی پر شکر و امتنان کے جذبات سے بھر تو گیا مگر ان کی سواریوں کے کجاوے اسی طرح بندھے کے بندھے رہے اور ان کی تلواریں اسی طرح کھنچی رہیں۔ ان کے ہاتھ، جو اب تک دفاع کے لیے اٹھ رہے تھے، اب جارحانہ اقدام کے لیے سرگرم کار ہو گئے کیونکہ گو عرب میں بدی نے ہتھیار ڈال دیے تھے، مگر اس کے باہر ہر چہار طرف اس کی حکمرانی پوری شان کے ساتھ قائم تھی اور مسلمان اپنے اس مشن کو بھول نہیں سکتے تھے کہ منکرات کو مٹا دینا چاہیے، جہاں کہیں بھی ہو، اور ہر غیر اللہ کی آقائی پامال ہو جانی چاہیے، خواہ وہ کسی گوشہ ارض پر ہو، یہ زمین خدا کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس پر اسی کا حکم چلنا چاہیے۔ اسی کے قانون کا اتباع ہونا چاہیے، اسی کی مرضی پوری ہونی چاہیے، اور اس "چاہیے" کی کل ذمہ داری میرے سر پر ہے۔ چنانچہ یہی ذمہ داری انھوں نے پورے احساس فرض کے ساتھ ادا کی، اور جب تک وہ ایسا کرتے رہے، اللہ تعالیٰ کی موعودہ تائید و نصرت ان کے ہمرکاب رہی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے باندھا ہوا عہد اقامت دین فراموش ہونا شروع ہوا اور دین حق کا چڑھتا ہوا سورج مسلمانوں کی قسمت کا ماتم کرتا ہوا زوال پذیر ہونے لگا۔ اور اب دوبارہ بام عروج پر آنے کے لیے اس مبارک صبح کا منتظر ہے جس میں حاملین قرآن عہد فراموشی کے خواب گراں سے بیدار ہو کر اپنے فرض منصبی کو از سر نو سنبھال لیں گے۔